

تفہیم القرآن

الذاریات

(۲)

ابراہیم نے کہا، اے فرستادگانِ الٰہی، کیا تم آپ کو درپیش تھے؟ انہوں نے کہا ”ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ اُس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسادیں جو آپ کے رب کے ہاں حد سے گزر جانے والوں کے لیے نشان زدہ ہیں“^۱ پھر ہم نے اُن سب لوگوں کو نکال لیا جو

^۲ چونکہ فرشتوں کا انسانی شکل میں آنا کسی بڑے اہم کام کے لیے ہوتا ہے، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی آمد کا مقصد پوچھنے کے لیے خطب کا لفظ استعمال فرمایا۔ خطب عربی زبان میں کسی معمولی کام کے لیے نہیں بلکہ کسی اہم عظیم کے لیے بولا جاتا ہے۔

^۱ مراد ہے قوم لوط۔ اُس کے جرائم اس قدر بڑھ چکے تھے کہ صرف ”مجرم قوم“ کا لفظ ہی یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ اس سے مراد کون سی قوم ہے۔ اس سے پہلے قرآن مجید میں حسبِ ذیل مقامات پر اس کا ذکر گزر چکا ہے:

تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۵۱ تا ۵۳ - ۳۵۵ تا ۳۵۹ - ۵۱۰ تا ۵۱۵ - جلد سوم، ص ۱۷۰ - ۵۲۶ تا ۵۳۱ - ۵۸۶ - ۵۸۷ - ۵۹۲ تا ۵۹۸ - جلد چہارم، القافات، ص ۳۰۶ -

^۲ یعنی ایک ایک پتھر پر آپ کے رب کی طرف سے نشان لگا دیا گیا ہے کہ اُسے کس مجرم کی سرکوبی کرنی ہے۔ سورہ ہود اور البقرہ میں اس عذاب کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے کہ اُن کی بستیوں کو تھپٹ کر دیا گیا اور اوپر سے پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسائے گئے۔ اس سے یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ شدید زلزلے کے اثر سے پورا علاقہ الٹ دیا گیا اور جو لوگ زلزلے سے بچ کر بھاگے ان کو آتش فشاں مادے کے پھروں کی بارش نے ختم کر دیا۔

اُس سستی میں مومن تھے، اور وہاں ہم نے ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔ اس کے
 ۳۳ بیچ میں یہ قصہ چھوڑ دیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے یہ فرشتے کس طرح حضرت
 لوط کے ہاں پہنچے اور وہاں اُن کے اور قوم لوط کے درمیان کیا کچھ پیش آیا۔ یہ تفصیلات سورہ ہود، الحجر اور
 العنکبوت میں گزر چکی ہیں۔ یہاں صرف اُس آخری وقت کا ذکر کیا جا رہا ہے جب اس قوم پر عذاب نازل ہونے
 والا تھا۔

۳۳ یعنی پوری قوم میں، اور اُس کے پورے علاقے میں صرف ایک گھر تھا جس میں ایمان و اسلام کی
 روشنی پائی جاتی تھی، اور وہ تھا حضرت لوط علیہ السلام کا گھر تھا۔ باقی پوری قوم فسق و فجور میں ڈوبی ہوئی تھی،
 اور اُس کا سارا ملک گندگی سے لبریز ہو چکا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُس ایک گھر کے لوگوں کو بچا کر نکال
 لیا اور اس کے بعد اس ملک پر وہ تباہی نازل کی جس سے اس بدکار قوم کا کوئی فرد بچ کر نہ جاسکا۔
 اس آیت میں تین اہم مضامین بیان ہوئے ہیں۔

ایک یہ کہ اللہ کا قانونِ مکافات اُس وقت تک کسی قوم کی کامل تباہی کا فیصلہ نہیں کرتا جب تک اس
 میں کچھ قابلِ لحاظ بھلائی موجود رہے۔ مجرے لوگوں کی اکثریت کے مقابلے میں اگر ایک قلیل عنصر بھی ایسا پایا جاتا
 ہو جو بدی کو روکنے اور نیکی کے راستے کی طرف بلانے کے لیے کوشاں ہو، تو اللہ تعالیٰ اُسے کام کرنے کا موقع
 دیتا ہے اور اُس قوم کی مہلت میں اضافہ کرتا رہتا ہے جو ابھی خیر سے بالکل خالی نہیں ہوئی ہے۔ مگر جب حالت
 یہ ہو جائے کہ کسی قوم کے اندر آٹے میں نمک کے برابر بھی خیر باقی نہ رہے تو ایسی صورت میں اللہ کا قانون
 یہ ہے کہ جو دو چار نیک انسان اس کی بستنیوں میں بُرائی کے خلاف لڑتے لڑتے تھک کر عاجز آچکے ہوں
 انہیں وہ اپنی قدرت سے کسی نہ کسی طرح بچا کر نکال دیتا ہے اور باقی لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہے
 جو ہر شوخ و شتم مالک اپنے شر سے ہوتے پھلوں کے ساتھ کیا کرتا ہے۔

دوسرے یہ کہ "مسلمان" صرف اسی امت کا نام نہیں ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہے، بلکہ
 آپ سے پہلے کے تمام انبیاء اور ان کے پیرو بھی مسلمان ہی تھے۔ ان کے اویان الگ الگ نہ تھے کہ کوئی
 دین ابراہیمی ہو اور کوئی موسوی اور کوئی عیسوی۔ بلکہ وہ سب مُسلم تھے اور ان کا دین ہی اسلام تھا۔

بعد ہم نے وہاں بس ایک نشانی اُن لوگوں کے لیے چھوڑ دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہوں۔^{۳۵}

قرآن مجید میں یہ حقیقت جگہ جگہ اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ اس میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں: البقرہ، ۱۲۸، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، آل عمران، ۶۷، المائدہ، ۴۴، ۱۱۰، یونس، ۷۲، ۸۴، یوسف، ۱۰۱، الاعراف، ۱۲۶، النمل، ۳۱، ۴۲، ۴۴۔

تیسرے یہ کہ ”مومن“ اور ”مسلم“ کے الفاظ اس آیت میں بالکل ہم معنی استعمال ہوئے ہیں اس آیت کو اگر سورہ حجرات کی آیت ۴ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو اُن لوگوں کے خیال کی غلطی پوری طرح واضح ہو جاتی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ”مومن“ اور ”مسلم“ قرآن مجید کی دو ایسی مستقل اصطلاحیں ہیں جو ہر جگہ ایک ہی مفہوم کے لیے استعمال ہوئی ہیں اور ”مسلم“ لازماً اسی شخص کو کہتے ہیں جو ایمان کے بغیر معنی بظاہر دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا ہو۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، تفسیر سورہ حجرات، حاشیہ ۳۱)۔

۳۵۔ اس نشانی سے مراد بحیرہ مُردار (DEAD SEA) ہے جس کا جنوبی علاقہ آج بھی ایک عظیم الشان تباہی کے آثار پیش کر رہا ہے۔ ماہرین آثارِ قدیمہ کا اندازہ ہے کہ قوم لوط کے بڑے شہر غالباً شدید زلزلے سے زمین کے اندر دھنس گئے تھے اور ان کے اوپر بحیرہ مُردار کا پانی پھیل گیا تھا، کیونکہ اس بحیرے کا وہ حصہ جو ”اللسان“ نامی چھوٹے سے جزیرہ نما کے جنوب میں واقع ہے، صاف طور پر بعد کی پیداوار معلوم ہوتا ہے اور قدیم بحیرہ مُردار کے جو آثار اس جزیرہ نما کے شمال تک نظر آتے ہیں وہ جنوب میں پانے جانے والے آثار سے بہت مختلف ہیں۔ اس سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ جنوب کا حصہ پہلے بحیرے کی سطح سے بلند تھا، بعد میں کسی وقت دھنس کر اس کے نیچے چلا گیا۔ اس کے دھنسنے کا زمانہ بھی دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ معلوم ہوتا ہے، اور یہی تاریخی طوفان پر حضرت ابراہیم اور حضرت لوط کا زمانہ ہے۔ پچھلے سال ۱۹۶۵ء میں آثارِ قدیمہ کی تلاش کرنے والی ایک امریکی جماعت کو اللسان پر ایک بہت بڑا قبرستان ملا ہے جس میں ۲۰ ہزار سے زیادہ قبریں ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قریب میں کوئی بڑا شہر ضرور آباد ہو گا۔ مگر کسی ایسے شہر کے آثار اس پاس کبیں موجود نہیں ہیں جس

اور دتھاسے لیے نشانی ہے، موسیٰ کے قصے میں جب ہم نے اُسے صریح سند کے ساتھ فرعون کے پاس بھیجا تو وہ اپنے بل بوتے پر اکر گیا اور بولایا جادو گر ہے یا مجنون ہے۔ آخراً ہم نے اُسے اور اس کے لشکروں کو بکپڑا اور سب کو سمندر میں پھینک دیا اور وہ ملامت زدہ ہو کر رہ گیا۔

سے متصل اتنا بڑا قبرستان بن سکتا ہو۔ اس سے بھی یہ شبہ تعویث پاتا ہے کہ جس شہر کا یہ قبرستان تھا وہ بجز رے میں غرق ہو چکا ہے۔ بجز رے کے جنوب میں جو علاقہ ہے اس میں اب بھی ہر طرف تباہی کے آثار موجود ہیں اور زمین میں گندھک، رال، کول تار اور قدرتی گیس کے اتنے ذخائر پائے جاتے ہیں جنہیں بیکہ لگان ہوتا ہے کہ کسی وقت بجلیوں کے گرنے سے یا زلزلے کا لاوا نکلنے سے یہاں ایک جہنم بھٹ پڑی ہوگی و مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، صفحہ ۵۲۹ تا ۵۳۱۔

۳۶ یعنی ایسے صریح معجزات اور ایسی کھلی کھلی علامات کے ساتھ بھیجا جن سے یہ امر مشتبہ نہ رہا تھا کہ آپ خالقِ ارض و سما کی طرف سے مامور ہو کر آئے ہیں۔

۳۷ یعنی کبھی اس نے آپ کو ساحر قرار دیا، اور کبھی کہا کہ یہ شخص مجنون ہے۔

۳۸ اس چھوٹے سے فقرے میں تاریخ کی ایک پوری داستان سمیٹ دی گئی ہے۔ اس کو سمجھنے

کے لیے ذرا حتم تصور کے سامنے یہ نقشہ لے آئیے کہ فرعون اس وقت دنیا کے سب سے بڑے مرکز تہذیب و تمدن کا عظیم فرمانروا تھا جس کی شوکت و سطوت سے گرد و پیش کی ساری قومیں خوف زدہ تھیں۔ ظاہر بات ہے کہ وہ جب اپنے لشکروں سمیت اچانک ایک روز غرقاب ہوا ہوگا تو صرف مصر ہی میں نہیں، اس پاس کی تمام قوموں میں اس واقعہ کی دھوم مچ گئی ہوگی۔ مگر اس پر بجز ان لوگوں کے جن کے اپنے قریبی رشتہ دار غرق ہوئے تھے، باقی کوئی نہ تھا جو ان کے اپنے ملک میں، یا دنیا کی دوسری قوموں میں ماتم کرنا یا ان کا مرنیہ کہتا، یا کم از کم یہی کہنے والا ہوتا کہ افسوس، کیسے اچھے لوگ تھے جو اس حادثہ کے شکار ہو گئے۔ اس کے بجائے، چونکہ دنیا ان کے ظلم سے تنگ آئی ہوئی تھی، اس لیے ان کے عبرتناک انجام پر ہر شخص نے اطمینان کا سانس لیا، ہرزبان نے ان پر ملامت کی ٹھیکار برساتی، اور جس نے بھی

اور تمہارے لیے نشانی ہے، عادیں، جبکہ ہم نے ان پر ایک ایسی بے خیر سواہج دی کہ جس چیز پر بھی وہ گزر گئی اسے بوسیدہ کر کے رکھ دیا۔

اور تمہارے لیے نشانی ہے، ثمود میں جب ان سے کہا گیا تھا کہ ایک خاص وقت تک مزے کر لو۔ مگر اس تنبیہ پر بھی انہوں نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی۔ آخر کار ان کے

اس خبر کو سنا وہ بچار اٹھا کہ یہ ظالم اسی انجام کے مستحق تھے۔ سورہ دُخان میں اسی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ، پھر نہ آسمان ان پر رویا اور نہ زمین۔“
 (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورہ دُخان، حاشیہ ۲۵)

۳۹ اس ہوا کے لیے لفظ عقیق استعمال ہوا ہے جو بانجھ عورت کے لیے بولا جاتا ہے، اور لغت میں اس کے اصل معنی یا بس (خشک) کے ہیں۔ اگر اسے لغوی معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایسی سخت گرم و خشک ہوا تھی کہ جس چیز پر سے وہ گزر گئی اسے مسکھا کر رکھ دیا۔ اور اگر اسے محاورے کے مفہوم میں لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ بانجھ عورت کی طرح وہ ایسی ہوا تھی جو اپنے اندر کوئی نفع نہ رکھتی تھی۔ نہ خوشگوار تھی، نہ بارش لانے والی، نہ درختوں کو بار آور کرنے والی، اور نہ ان فائدوں میں سے کوئی فائدہ اُس میں تھا جن کے لیے ہوا کا چلنا مطلوب ہوتا ہے۔ دوسرے مقامات پر بتایا گیا ہے کہ یہ صرف بے خیر اور خشک ہی نہ تھی بلکہ نہایت شدید آندھی کی شکل میں آئی تھی جس نے لوگوں کو اٹھا اٹھا کر پٹخ دیا، اور یہ مسلسل آٹھ دن اور سات راتوں تک چلتی رہی، یہاں تک کہ قوم عاد کے پورے علاقے کو اس نے تہس نہس کر کے رکھ دیا (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورہ عم السجدہ، حواشی نمبر ۲۰-۲۱۔ الاحقاف، حواشی نمبر ۲۵ تا ۲۸)

یہ مفسرین میں اس امر پر اختلاف ہے کہ اس سے مراد کون سی بہلت ہے۔ حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ یہ اشارہ سورہ نبود کی اُس آیت کی طرف ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ثمود کے لوگوں نے جب حضرت صالح کی اونٹنی کو ہلاک کر دیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو خبردار کر دیا گیا کہ تین دن تک مزے کر لو، اس کے بعد تم پر عذاب آجائے گا۔ بخلاف اس کے حضرت حسن بصری کا خیال ہے کہ یہ بات

دیکھتے دیکھتے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب نے ان کو آیا، پھر نہ ان میں اٹھنے کی سکت تھی اور نہ وہ اپنا بچاؤ کر سکتے تھے۔

اور ان سب پہلے ہم نے لوح کی قوم کو ہلاک کیا کیونکہ وہ فاسق لوگ تھے۔
آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں۔ زمین کو ہم نے

حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی دعوت کے آغاز میں اپنی قوم سے فرمائی تھی اور اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم توبہ و ایمان کی راہ اختیار نہ کرو گے تو ایک خاص وقت تک ہی تم کو دنیا میں عیش کرنے کی مہلت نصیب ہو سکے گی اور اس کے بعد تمہاری شامت آجائے گی۔ ان دونوں تفسیروں میں سے دوسری تفسیر ہی زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ بعد کی آیت فَعَتَوْنَا عَنْ آمْرٍ وَتَبَهُرُ دِمْپَرِ انہوں نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی یہ بتاتی ہے کہ جس مہلت کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے وہ سرتابی سے پہلے دی گئی تھی اور انہوں نے سرتابی اس تشبیہ کے بعد کی۔ اس کے برعکس سورہ ہود والی آیت میں تین دن کی جس مہلت کا ذکر کیا گیا ہے وہ ان ظالموں کی طرف سے آخری اور فیصلہ کن سرتابی کا ارتکاب ہو جانے کے بعد دی گئی تھی۔

۱۱۰ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اس عذاب کے لیے مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ کہیں اسے رَجْفٌ دُوبِلَا دِينَے والی اور ہَلَا مَارِنے والی آفت، کہا گیا ہے۔ کہیں اس کو صَنْجِعٌ دُوبِلَا کے اور کڑکے، سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کہیں اس کے لیے طَاعِیْبٌ دَانْتَهَانِی شَدِیْدٌ آفَتٌ، کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور یہاں اسی کو صَاعِقَةٌ کہا گیا ہے جس کے معنی بجلی کی طرح اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت کے بھی ہیں اور سخت کڑک کے بھی۔ غالباً یہ عذاب ایک ایسے زلزلے کی شکل میں آیا تھا جس کے ساتھ خوفناک آواز بھی تھی۔

۱۱۱ اصل الفاظ ہیں مَا كَانُوا مُنْتَصِرِينَ۔ انصار کا لفظ عربی زبان میں دو معنوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں اپنے آپ کو کسی کے حملہ سے بچانا۔ اور دوسرے معنی ہیں حملہ کرنے والے سے بدل لینا۔

بچایا ہے اور ہم بڑے اچھے ہموار کرنے والے ہیں۔ اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں، شاید کہ تم اس سے سبق لو۔ پس دوڑو اللہ کی طرف، میں تمہارے لیے اس کی طرف سے صاف صاف

۳۳۵ آخرت کے حق میں تاریخی دلائل پیش کرنے کے بعد اب پھر اسی کے ثبوت میں آفاقی دلائل پیش

کیے جا رہے ہیں۔

۳۳۶ اصل الفاظ ہیں وَإِنَّا لَمُوَسِّعُونَ۔ موسع کے معنی طانت و مقدرت رکھنے والے کے بھی

ہو سکتے ہیں اور وسیع کرنے والے کے بھی۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ آسمان ہم نے کسی کی مدد سے نہیں بلکہ اپنے زور سے بنایا ہے اور اس کی تخلیق ہماری مقدرت سے باہر نہ تھی۔ پھر یہ تصور تم لوگوں کے دماغ میں آخر کیسے آگیا کہ ہم تمہیں دوبارہ پیدا نہ کر سکیں گے؟ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ اس عظیم کائنات کو ہم بس ایک دفعہ بنا کر نہیں رہ گئے ہیں بلکہ مسلسل اس میں توسیع کر رہے ہیں اور ہر آن اس میں ہماری تخلیق کے نئے نئے کوشے رونما ہو رہے ہیں۔ ایسی زبردست خلاق ہستی کہ آخر تم نے اعادہ خلق سے عاجز کیوں سمجھ رکھا ہے؟

۳۳۷ اس کی تشریح حاشیہ ۱۸ میں گزر چکی ہے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد

سوم، ص ۵۹۰ تا ۵۹۲۔ جلد چہارم، تفسیر سورہ یس، حاشیہ ۲۹۔ الزخرف، حواشی ۷ تا ۱۰۔

۳۳۸ یعنی دنیا کی تمام اشیاء تزویج کے اصول پر بنائی گئی ہیں۔ یہ سارا کارخانہ عالم اس قاعدے

پر چل رہا ہے کہ بعض چیزوں کا بعض چیزوں سے جوڑ بگتا ہے اور پھر ان کا جوڑ لگنے ہی سے طرح طرح کی ترکیبات وجود میں آتی ہیں۔ یہاں کوئی شے بھی ایسی منفرد نہیں ہے کہ دوسری کوئی شے اس کا جوڑ نہ ہو، بلکہ ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر ہی نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم یس، حاشیہ ۳۱۔ الزخرف، حاشیہ ۱۲۔

۳۳۹ مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات کا تزویج کے اصول پر بنایا جانا، اور دنیا کی تمام اشیاء کا

زوج زوج ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو آخرت کے وجوب پر صریح شہادت دے رہی ہے اگر تم غور کرو تو اس سے خود تمہاری عقل یہ نتیجہ اخذ کر سکتی ہے کہ جب دنیا کی ہر چیز کا ایک جوڑا ہے، اور کوئی چیز

خبردار کرنے والا ہوں۔ اور نہ بناؤ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود، میں تمہارے لیے اس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں۔

اپنے جڑے سے ملے بغیر نتیجہ خیز نہیں ہوتی، تو دنیا کی یہ زندگی کیسے بے جڑ ہو سکتی ہے؟ اس کا جوڑا لازماً آخرت ہے۔ وہ نہ ہو تو یہ قطعاً بے نتیجہ ہو کر رہ جائے۔

آگے کے مضمون کو سمجھنے کے لیے اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اگرچہ یہاں تک ساری بحث آخرت کے موضوع پر چلی آرہی ہے، لیکن اسی بحث اور انہی دلائل سے توجید کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ بارش کا انتظام، زمین کی ساخت، آسمان کی تخلیق، انسان کا اپنا وجود، کائنات میں قانون تزویج کی حیرت انگیز کار فرمائی، یہ ساری چیزیں جس طرح آخرت کے امکان و وجوب پر گواہ ہیں اسی طرح یہی اس بات کی شہادت بھی دے رہی ہیں کہ یہ کائنات نہ بے خدا ہے اور نہ اس کے بہت سے خدا ہیں، بلکہ ایک خدائے حکیم و قادر مطلق ہی اس کا خالق اور مالک اور مدبر ہے۔ اس لیے آگے انہی دلائل کی بنیاد پر توجید کی دعوت پیش کی جا رہی ہے۔ علاوہ بریں آخرت کو ماننے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان خدا سے بغاوت کا رویہ چھوڑ کر اطاعت و بندگی کی راہ اختیار کرے۔ وہ خدا سے اسی وقت تک پہرا رہتا ہے جب تک وہ اس غفلت میں مبتلا رہتا ہے کہ میں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں اور اپنی دنیوی زندگی کے اعمال کا کوئی حساب مجھے کسی کو دینا نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی جس وقت بھی رفع ہو جائے، اس کے ساتھ ہی فرداً آدمی کے ضمیر میں یہ احساس ابھر آتا ہے کہ اپنے آپ کو غیر ذمہ دار سمجھ کر وہ بڑی بھاری غلطی کر رہا تھا اور یہ احساس اُسے خدا کی طرف پلٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اسی بنا پر آخرت کے دلائل ختم کرتے ہی معا بعد یہ فرمایا گیا ”پس وڈو اللہ کی طرف“۔

۱۱۷ یہ فقرے اگرچہ اللہ ہی کا کلام ہیں مگر ان میں متکلم اللہ تعالیٰ نہیں بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ گویا بات دراصل یوں ہے کہ اللہ اپنے نبی کی زبان سے یہ کہلوایا ہے کہ وڈو اللہ کی طرف، میں تمہیں اُس کی طرف سے خبردار کرتا ہوں۔ اس طرز کلام کی مثال قرآن کی اولین سورۃ، یعنی سورۃ فاتحہ میں موجود ہے جس میں کلام تو اللہ تعالیٰ ہی کا ہے مگر متکلم کی حیثیت سے بندے عرض کرتے ہیں: اِيَّاكَ تَعْبُدُ

یونہی ہوتا رہا ہے، ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسول ایسا نہیں آیا جسے انہوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنون۔^{۶۹} کیا ان سب نے آپس میں اس پر کوئی سمجھوتہ کر لیا ہے؟ نہیں، بلکہ یہ سب سرکش لوگ بنیں۔ پس اے نبی، ان سے رخ پھیر لو، تم پر کچھ ملامت نہیں۔^{۷۰}

وَإِيَّاكَ فَسْتَعِينُ، اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ۔ جس طرح وہاں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ "اے اہل ایمان تم اپنے رب سے یوں دعا مانگو، مگر فحوائے کلام سے خود بخود یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ یہ ایک دعا ہے جو اللہ اپنے بندوں کو سکھا رہا ہے، اسی طرح یہاں بھی یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ "اے نبی تم ان لوگوں سے کہو، مگر فحوائے کلام خود بتا رہا ہے کہ یہ توحید کی ایک دعوت ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں۔ سورہ فاتحہ کے علاوہ اس طرز کلام کی اور بھی متعدد نظیریں قرآن مجید میں موجود ہیں جن میں کلام تو اللہ ہی کا ہوتا ہے مگر منکلم کہیں فرشتے ہوتے ہیں اور کہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم، اور اس امر کی تصریح کے بغیر کہ یہاں منکلم کون ہے، سیاق عبارت سے خود بخود یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اللہ اپنا یہ کلام کس کی زبان سے ادا کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورہ مریم ۶۴-۶۵۔ الصافات

۱۵۹ تا ۱۶۷۔ الشوریٰ ۱۰۔

^{۶۹} یعنی آج پہلی مرتبہ ہی یہ واقعہ پیش نہیں آیا ہے کہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسول کی زبان سے آخرت کی خبر اور توحید اللہ کی دعوت سن کر لوگ اسے ساحر اور مجنون کہہ رہے ہیں۔ رسالت کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ جب سے نوع انسانی کی ہدایت کے لیے رسول آنے شروع ہوئے ہیں، آج تک جاہل لوگ اسی ایک حماقت کا پوری کیسانی کے ساتھ اعادہ کیے چلے جا رہے ہیں جس رسول نے بھی آکر خبردار کیا کہ تم بہت سے خداؤں کے بندے نہیں ہو بلکہ صرف ایک ہی خدا تمہارا خالق و معبود اور تمہاری قسمتوں کا مالک و مختار ہے، جاہلوں نے شور مچا دیا کہ یہ جا دو گر ہے جو اپنے افسوں سے ہماری عقلوں کو بگاڑنا چاہتا ہے جس رسول نے بھی آکر خبردار کیا کہ تم غیر ذمہ دار بنا کر دنیا میں نہیں چھوڑ دیئے گئے ہو بلکہ اپنا کارنامہ حیات ختم کرنے کے بعد تمہیں اپنے خالق و مالک کے سامنے حاضر ہو کر اپنا حساب دینا ہے اور اس حساب کے نتیجہ میں اپنے اعمال کی جزا و سزا پانی ہے، نادان لوگ چیخ اٹھے کہ یہ پاگل ہے، اس کی عقل ماری گئی ہے، بھلا مرنے

کے بعد ہم کہیں دوبارہ بھی زندہ ہو سکتے ہیں۔

۱۵۷ یعنی یہ بات تو ظاہر ہے کہ ہزار ہا برس تک ہر زمانے میں مختلف ملکوں اور قوموں کے لوگوں کا دعوتِ انبیاء کے مقابلے میں ایک ہی رویت اختیار کرنا، اور ایک ہی طرح کی باتیں اُن کے خلاف بنانا کچھ اس بنا پر تو نہ ہو سکتا تھا کہ ایک کانفرنس کر کے ان سب اگلی اور پچھلی نسلوں نے آپس میں یہ طے کر لیا ہو کہ جب کوئی نبی اگر یہ دعوت پیش کرے تو اس کا یہ جواب دیا جائے۔ پھر اُن کے رویتے کی یہ کیسائی اور ایک ہی طرزِ جواب کی یہ مسلسل تکرار کیوں ہے؟ اس کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں ہے کہ طغیان و سرکشی ان سب کا مشترک وصف ہے۔ چونکہ ہر زمانے کے جاہل لوگ خدا کی بندگی سے آزاد اور اُس کے تعاسب سے بے خوف ہو کر دنیا میں شتر پے مہار کی طرح جینے کے خواہاں رہے ہیں، اس لیے اور صرف اسی لیے جس نے بھی اُن کو خدا کی بندگی اور خدا ترسانہ زندگی کی طرف بلایا اس کو وہ ایک ہی گناہ کا جواب دیتے رہے۔

اس ارشاد سے ایک اور اہم حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ منکالت اور ہدایت نیکی اور بدی، ظلم اور عدل اور ایسے ہی دوسرے اعمال کے جو محرکات نفسِ انسانی میں باطنی موجود ہیں اُن کا ظہور ہمیشہ ہر زمانے میں اور زمین کے ہر گوشے میں ایک ہی طرح ہوتا ہے، خواہ فرائض و مسائل کی ترقی سے اس کی شکلیں بظاہر کتنی ہی مختلف نظر آتی ہوں۔ آج کا انسان خواہ ٹینکوں اور ہوائی جہازوں اور ہائیڈروجن بموں کے ذریعہ سے ٹرے اور قدیم زمانے کا انسان چاہے پتھروں اور لاطھیوں سے لڑتا ہو، مگر انسانوں کے درمیان جنگ کے بنیادی محرکات میں سرسود فرق نہیں آیا ہے۔ اسی طرح آج کا ملحد اپنے الحاد کے لیے دلائل کے خواہ کتنے ہی انبار لگاتا رہے، اُس کے اس راہ پر جانے کے محرکات بعینہ وہی ہیں جو آج سے ۶ ہزار برس پہلے کے کسی ملحد کو اس طرف لے گئے تھے اور بنیادی طور پر وہ اپنے استدلال میں بھی اپنے سابق پیشواؤں سے کچھ مختلف نہیں ہے۔

۱۵۸ اس آیت میں دین کی تبلیغ کا ایک قاعدہ بیان فرمایا گیا ہے جس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ ایک داعیِ حق جب کسی شخص کے سامنے معقول دلائل کے ساتھ اپنی دعوتِ صاف صاف پیش کر دے اور

البتہ نصیحت کرتے رہو، کیونکہ نصیحت ایمان لانے والوں کے لیے نافع ہے۔

اس کے شبہات و اعتراضات اور دلائل کا جواب بھی دے دے تو حق واضح کرنے کا جو فرض اس کے ذمے تھا اس سے وہ سبکدوش ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ شخص اپنے عقیدہ و خیال پر جابر ہے تو اس کی کوئی ذمہ داری داعی حق پر عائد نہیں ہوتی۔ اب کچھ ضرور نہیں کہ وہ اسی شخص کے پیچھے پڑا رہے، اسی سے بحث میں اپنی عمر کھپائے چلا جائے، اور اس کا کام بس یہ رہ جائے کہ اُس ایک آدمی کو کسی نہ کسی طرح اپنا ہم خیال بنا لے۔ داعی اپنا فرض ادا کر چکا۔ وہ نہیں مانتا تو نہ مانے۔ اس کی طرف التفات نہ کرنے پر داعی کو یہ الزام نہیں دیا جاسکتا کہ تم نے ایک آدمی کو گمراہی میں مبتلا رہنے دیا، کیونکہ اب اپنی گمراہی کا وہ شخص خود ذمہ دار ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ قاعدہ اس لیے بیان نہیں کیا گیا ہے کہ معاذ اللہ آپ اپنی تبلیغ میں بیجا طریقے سے لوگوں کے پیچھے پڑ جاتے تھے اور اللہ تعالیٰ آپ کو اس سے روکنا چاہتا تھا۔ دراصل اس کے بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک داعی حق جب کچھ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ معتول طریقے سے سمجھانے کا حق ادا کر چکتا ہے اور ان کے اندر ضد اور جھگڑا لوہن کے آثار دیکھ کر ان سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے تو وہ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور اس پر الزام رکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ واہ صاحب، آپ اچھے دعوتِ حق کے علمبردار ہیں، ہم آپ سے بات سمجھنے کے لیے بحث کرنا چاہتے ہیں، اور آپ ہماری طرف التفات نہیں کرتے۔ حالانکہ ان کا مقصد بات کو سمجھنا نہیں بلکہ اپنی بھنا بھنی میں داعی کو الجھانا اور محض اس کی تضحیک اوقات کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلامِ پاک میں بالفاظِ صریح یہ فرما دیا کہ "ایسے لوگوں کی طرف التفات نہ کرو ان سے بے التفاتی کرنے پر تمہیں کوئی ملامت نہیں کی جاسکتی" اس کے بعد کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ الزام نہیں دے سکتا تھا کہ جو کتاب آپ لے کر آئے ہیں اس کی رو سے تو آپ ہم کو اپنا دین سمجھنے پر مامور ہیں، پھر آپ ہماری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے۔

۱۱۳ اس آیت میں تبلیغ کا دوسرا قاعدہ بیان کیا گیا ہے۔ دعوتِ حق کا اصل مقصد ان

میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ تیری بندگی کریں۔^{۵۳} میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ اللہ

سعید روحوں تک ایمان کی نعمت پہنچانا ہے جو اس نعمت کی قدر شناس ہوں اور اُسے خود حاصل کرنا چاہیں۔ مگر داعی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انسانی معاشرے کے ہزاروں لاکھوں افراد میں وہ سعید ہیں کہاں ہیں۔ اس لیے اُس کا کام یہ ہے کہ اپنی دعوتِ عام کا سلسلہ برابر جاری رکھے تاکہ جہاں جہاں بھی ایمان قبول کرنے والے افراد موجود ہوں وہاں اس کی آواز پہنچ جائے۔ یہی لوگ اس کی اصل دولت ہیں۔ انہی کی تلاش اس کا اصل کام ہے۔ اور انہی کو سمیٹ سمیٹ کر خدا کے راستے پر لاکھڑا کرنا اس کے پیش نظر ہونا چاہیے۔ بیچ میں اولادِ آدم کا جو فضول عنصر اس کو ملے اُس کی طرف بس اسی وقت تک داعی کو توجہ کرنی چاہیے جب تک اُسے تجربے سے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ جنس کا سد ہے۔ اُس کے کساد و فنا کا تجربہ ہو جانے کے بعد اُسے پھر اپنا قیمتی وقت اس جنس کے لوگوں پر ضائع نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ اُس کی تذکیر سے نفع اٹھانے والے لوگ نہیں ہیں، اور ان پر اپنی قوت صرف کرنے سے نقصان اُن لوگوں کا ہوتا ہے جو اس سے نفع اٹھانے والے ہیں۔

^{۵۳} یعنی میں نے ان کو دوسروں کی بندگی کے لیے نہیں بلکہ اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ تیری بندگی تو ان کو اس لیے کرنی چاہیے کہ میں ان کا خالق ہوں۔ دوسرے کسی نے جب ان کو پیدا نہیں کیا ہے تو اُس کو کیا حق پہنچتا ہے کہ یہ اس کی بندگی کریں، اور ان کے لیے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ ان کا خالق تو جوں میں اور یہ بندگی کرتے پھریں دوسروں کی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف جنوں اور انسانوں ہی کا خالق تو نہیں ہے بلکہ سارے جہان اور اس کی ہر چیز کا خالق ہے، پھر یہاں صرف جنوں اور انسانوں ہی کے متعلق کیوں فرمایا گیا کہ میں نے ان کو اپنے سوا کسی کی بندگی کے لیے پیدا نہیں کیا ہے؟ حالانکہ مخلوقات کا ذرہ ذرہ اللہ ہی کی بندگی کے لیے ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ زمین پر صرف جن اور انسان ایسی مخلوق ہیں جن کو یہ آزادی بخشی گئی ہے کہ اپنے دائرہ اختیار میں اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنا چاہیں تو کریں، ورنہ وہ بندگی

سے مُنہ بھی موڑ سکتے ہیں، اور اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی بھی کر سکتے ہیں۔ دوسری جتنی مخلوقات بھی اس دنیا میں ہیں وہ اس نوعیت کی کوئی آزادی نہیں رکھتیں۔ اُن کے لیے سرے سے کوئی دائرہ اختیار ہے ہی نہیں کہ وہ اس میں اللہ کی بندگی نہ کریں یا کسی اور کی بندگی کر سکیں۔ اس لیے یہاں صرف جنوں اور انسانوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنے اختیار کے حدود میں اپنے خالق کی اطاعت و عبودیت سے مُنہ موڑ کر، خالق کے سوا دوسروں کی بندگی کر کے خود اپنی فطرت کے لیے ہیں، اُن کو یہ جاننا چاہیے کہ وہ خالق کے سوا کسی کی بندگی کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں اور ان کے لیے سیدھی رُہ یہ ہے کہ جو آزادی نہیں بخشی گئی ہے اسے غلط استعمال نہ کریں بلکہ اس آزادی کے حدود میں بھی خود اپنی مرضی سے اسی طرح خدا کی بندگی کریں جس طرح اُن کے جسم کا روگٹا روگٹا ان کی زندگی کے غیر اختیاری حدود میں لگی بندگی کر رہا ہے۔

عبادت کا لفظ اس آیت میں محض نماز روزے اور اسی نوعیت کی دوسری عبادات کے معنی میں استعمال نہیں کیا گیا ہے کہ کوئی شخص اس کا مطلب یہ لے کہ جن اور انسان صرف نماز پڑھنے اور روزے رکھنے اور تسبیح و تہلیل کرنے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ یہ مفہوم بھی اگرچہ اس میں شامل ہے، مگر یہ اس کا پورا مفہوم نہیں ہے۔ اس کا پورا مفہوم یہ ہے کہ جن اور انسان اللہ کے سوا کسی اور کی پرستش، اطاعت، فرمانبرداری اور نیا زندگی کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں۔ ان کا کام کسی اور کے سامنے جھکنا، کسی اور کے احکام بجا لانا، کسی اور سے تعقیب کرنا، کسی اور کے بنائے ہوئے دین کی پیروی کرنا، کسی اور کو اپنی قسمتوں کا بنانا اور بگاڑنے والا سمجھنا۔ اور کسی دوسری بستی کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلانا نہیں ہے۔ دفرید تشریح کیلئے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورہ بقرہ، حاشیہ ۶۲۔ الزمر، حاشیہ ۲۔ الباقیہ حاشیہ ۳

ایک اور بات جو ضمنی طور پر اس آیت سے صاف ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جن انسانوں کے الگ ایک مستقل مخلوق ہے۔ اس سے اُن لوگوں کے خیال کی غلطی بالکل واضح ہو جاتی ہے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ انسانوں ہی میں سے کچھ لوگوں کو قرآن میں جن کہا گیا ہے۔ اسی حقیقت پر قرآن مجید کی حسب ذیل آیات بھی ناقابل انکار شہادت بہم پہنچاتی ہیں: الانعام، ۱۰۰، ۱۲۸۔ الاعراف، ۳۸، ۱۷۹۔ ہود، ۱۱۹۔ الحجر، ۲۷ تا ۳۳۔ بنی اسرائیل، ۸۸۔ البکہف، ۵۰۔ السجده، ۱۳۔ سبا، ۴۱۔ ص، ۷۵، ۷۶۔ حم السجده، ۲۵۔ الاحقاف، ۱۸۔ الرحمن، ۱۵، ۳۹، ۵۶۔ اس مشلے پر متصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر القرآن،

تو خود ہی رزاق ہے، بڑی قوت والا اور زبردست۔ پس جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے حصے کا بھی ویسا ہی عذاب تیار ہے جیسا انہی جیسے لوگوں کو ان کے حصے کا مل چکا ہے، اس کے لیے یہ لوگ مجھ سے جلدی نہ مچائیں۔ آخر کو تباہی ہے کفر کرنے والوں کے لیے اس روز جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے۔

جد سوم، ص ۱۴۴-۱۴۸-۵۶۲-۵۶۳-۵۴۵-۵۴۶-جلد چہارم، تفسیر سورہ سبا، حاشیہ ۱۲۴

۵۵ یعنی میری کوئی غرض جنوں اور انسانوں سے اٹنی ہوئی نہیں ہے کہ یہ میری عبادت کر چکے تو میری خدائی چلے گی اور یہ میری بندگی سے منہ موڑینگے تو میں خدا نہ رہونگا۔ میں ان کی عبادت کا محتاج نہیں ہوں بلکہ میری عبادت کرنا خود انکی اپنی فطرت کا تقاضا ہے، اسی کے لیے یہ پیدا کیے گئے ہیں اور اپنی فطرت سے لڑنے میں ان کا اپنا نقصان ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ میں ان رزق نہیں چاہتا اور یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں، اس میں ایک لطیف تعریف ہے۔ خدا سے برگشتہ لوگ دنیا میں جن جن کی بندگی بجا رہے ہیں، وہ سب درحقیقت اپنے ان بندوں کے محتاج ہیں۔ ان کی خدائی نہ چلائی تو ایک دن بھی وہ نہ چلے۔ وہ ان کے رزق نہیں بلکہ اُنٹے یہ ان کو رزق پہنچاتے ہیں۔ وہ ان کو نہیں کھلاتے بلکہ اُنٹے یہ ان کو کھلاتے ہیں۔ وہ ان کی جان کے محافظ نہیں بلکہ اُنٹے یہ ان کی جانوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان کے لشکر یہ ہیں جن کے بل پر ان کی خدائی چلتی ہے۔ جہاں بھی ان جھوٹے خداؤں کی حمایت کرنے والے بندے رہے، یا بندوں نے ان کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا وہاں ان کسب ٹھاکھ پڑے رکھے اور دنیا کی آنکھوں نے ان کی کس میرسی کا حال دیکھ لیا۔ سارے معبودوں میں اکیلا ایک اللہ جل شانہ ہی وہ حقیقی معبود ہے جس کی خدائی اپنے بل بوتے پر چل رہی ہے، جو اپنے بندوں سے کچھ لیتا نہیں بلکہ وہی اپنے بندوں کو سب کچھ دیتا ہے

۵۵ اصل میں لفظ "میتن" استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں مضبوط اور غیر متزلزل، جسے کوئی ہلانہ سکتا ہو۔

۵۶ ظلم سے مراد یہاں حقیقت اور صداقت پر ظلم کرنا، اور خود اپنی فطرت پر ظلم کرنا ہے۔ میاق و سباق خود تیار ہا کر یہاں ظلم کرنے والوں کو وہ لوگ مراد ہیں جو خداوند عالم کے سوا دوسروں کی بندگی کر رہے ہیں، جو آخرت کے منکر ہیں اور اپنے آپ کو دنیا میں غیر ذمہ دار سمجھ رہے ہیں اور ان انبیاء کو جھٹل رہے ہیں جنہوں نے ان کو حقیقت خبردار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ۵۷ یہ جواب ہے کفار کے اس مطالبہ کا کہ وہ یوم الجزا کہاں آتے آتے رہ گیا ہے، آخر وہ آئیوں نہیں جاتا۔